© rasailojaraid.com

گروہ اپنی ہی پسند کی ہوئی منزل کی طرف پوری تحریک اور جماعت کو کھینچ لے جانا چاہے گا۔ نتیجہ میں فکری وحدت اور عملی ہم آہنگی ناپید ہونے لگے گی، اور تحریک کا سفینہ باہمی کش مکش کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر بالآخر غرق ہو رہے گا۔

دوسرے عوامل فساد کے مقابلہ میں اس روحانی مرض کا معاملہ اپنے علاج کے پہلو سے بھی بڑا ہی اہم اور نازک ہے۔ کیونکہ یہ مرض بالعموم انسان کے لاشعور یا تحت الشعور میں جنم لیتا ہے، اور پھر اسی کمین گاہ میں رہ کر اخلاص و للّٰہیت کی پونجی کو گھن کی طرح چاٹتا رہتا ہے، اس لیے اس کا نگاہِ احتساب کی گرفت میں آ جانا، بہت دشوار ہوتا ہے۔ گہرائیوں تک اتر جانے والی نظریں بھی اکثر اسے دیکھ پانے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔

پھر اگر خوش قسمتی سے کسی طرح اس مرض کی موجودگی کا احساس ہو بھی جائے، تو اس کا صحیح صحیح اعتراف کر لینا کچھ آسان نہیں رہتا۔ کیوں کہ ایک تو، اس کے لیے ایمانی حس کی بیداری اور اخلاقی جرات کی فراوانی درکار ہوتی ہے۔ دوسرے، نوع انسانی کا ازلی دشمن اپنی مسلسل جنگ کا سب سے اہم مورچہ مومن کے قلب کو اور اس قلب کے جذبہ اخلاص و للّٰہیت ہی کو سمجھتا ہے۔ اس لیے اس مورچہ کی جیتی ہوئی کوئی چوکی وہ آسانی سے خالی نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے آخر وقت تک گھٹنے ٹیک کر لڑتا رہتا ہے، اور اپنا کوئی داؤ استعمال کرنے سے بچا نہیں رکھتا۔ کبھی دینداری کے پندار کو مشتعل کرتا ہے، کبھی نفس کے جھوٹے وقار کو غیرت دلاتا ہے، کبھی خوشنما تاویلوں کی افیون پلاتا ہے۔ اور اس طرح جی توڑ کر کوشش کرتا ہے کہ انسان کے اندر کا یہ انگڑائیاں لینے والا احساسِ للّٰہیت پھر غفلت کی نیند سو جائے۔ لہٰذا یہ اللہ کی عطا کی ہوئی خاص توفیق ہی ہے جو انسان کو اپنے اندر کھوٹ کا ٹھیک ٹھیک اعتراف کر لینے میں کامیاب بنا سکتی ہے۔

اس مرض کے اعتراف کے بعد تیسرا مرحلہ اس کے علاج کا آتا ہے، جو بجائے خود ایک بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے مضبوط ارادے، صحیح تدبیر، مناسب پرہیز اور ایک طویل سعی و جہد کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں بسا اوقات ایک لمحہ کی غفلت منزل سے سیکڑوں کوس دور پھینک دیتی ہے۔ غرض اس راہ ہفت خوان کا ہر مرحلہ انتہائی دشوار گزار اور صبر آزما ہے۔ لیکن جسے اپنے مقصد حیات سے واقعی محبت ہو اور کسی حال میں بھی اس کی بربادی گوارا نہ ہو، اسے خوش دلی کے ساتھ ان سارے مرحلوں کو طے کرنا ہی ہو گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲- دینی علم و بصیرت کی خامی

دوسرا بڑا عامل، دین کے اصل سرچشموں سے راست رہنمائی حاصل کرتے رہنے کی عملی صلاحیت سے محرومی کا عامل ہے۔

اس سے بیک وقت دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک صحیح اجتہاد فکر میں اضمحلال، اور دوسرے، دینی بے بصیرتی۔ یعنی اس کے نتیجے میں ایک طرف تو تحریک کے علم برداروں پر فکری جمود اور ذہنی افلاس کا فالج گرتا ہے، دوسری طرف فکری انارکی کا فتنہ پھیلنے لگتا ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کسی تحریک میں زندگی کا نمو اور صحیح سمت پر حرکت و اقدام کی صلاحیت اسی وقت تک رہتی ہے، جب تک اسے فکری اجتہاد کی غذا ملتی رہے، اور اصل دینی سرچشموں سے اس کی راست آبیاری کا سلسلہ جاری رہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے کارفرما عناصر ان سرچشموں کا راست علم رکھتے ہوں اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضروری صلاحیت کے حامل ہوں، اور پھر اس صلاحیت سے کام لینا بھی جانتے ہوں۔ اسی کے ساتھ تحریک کے عام افراد بھی دین سے فی الجملہ واقف اور اس کے مزاج شناس ہوں، خود اپنی حدود کو بھی ٹھیک پہچانتے ہوں۔ لیکن اگر یہ صورت حال باقی نہ رہ سکے اور لوگ اپنے فرائض اور اپنی حدود کا لحاظ نہ رکھیں، خواص کتاب و سنت کو عملاً اپنا اصل رہنما بنائے رکھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو جائیں، یا صلاحیت رکھنے کے باوجود اس سے کام لینے کی خود اعتمادی سے محروم ہو رہیں، اور دوسری طرف عوام بر خود غلط ہو جائیں، اپنی معمولی اور بالواسطہ دینی معلومات کے بل پر بطور خود دین کے تقاضے متعین کرنے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق تحریک کی راہ عمل مقرر کرنے لگیں، حتیٰ کہ انھیں دیکھ کر اَفتَوا بِغَیرِ عِلمٍ فَضَلُّوا وَاَضَلُّوا (علم کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں) کی حالت پیدا ہو جائے، تو ظاہر ہے ایسے دن تحریک کے لیے بڑے ہی نامبارک ہوں گے۔ اس وقت اس کا حال اس کشتی کا سا ہو جائے گا جس کے ناخدا تو چپو پھینک کر الگ بیٹھ گئے ہوں، اور کشتی کے مسافر اپنے اپنے ہاتھوں کو چپو بنا کر، جدھر جی چاہتا ہو کشتی کو بہالے جانے کے شغل میں مصروف ہوں۔

۳- شخصیت پرستی

تیسرا عامل، جو اس دوسرے عامل سے بڑا قریبی رشتہ بھی رکھتا ہے، "شخصی عقیدتوں کا غلو" ہے، جسے عرف عام میں شخصیت پرستی کہا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے، اور تاریخی شواہد اس مطالعے کی تصدیق کرتے ہیں، کہ اس مرض کا حملہ دینی تحریکوں پر بہت ہوا کرتا ہے، اور جب ہوتا ہے تو بڑا خوفناک بھی ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شخصیت پرستی کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے ساتھ لوگوں کا تعلق کسی بڑی شخصیت کی عقیدت کے واسطے سے ہو اور یہ عقیدت اس تعلق پر غالب ہو، خواہ اس تعلق کی ابتدا ہی اسی انداز سے ہوئی ہو یا بعد میں وہ یہ نوعیت اختیار کر گیا ہو۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی شخصیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور جس بات کو بھی صحیح مانتے ہیں اس کی سند کے بعد ہی صحیح مانتے ہیں۔ وہ اسے سخت بے ادبی سمجھتے ہیں کہ ایسے مقدس شخص کی کسی رائے، کسی فتوے اور کسی نظریے کو عقلی اور نقلی دلائل کی ترازو میں تولا جائے، اور تول لینے کے بعد ہی اسے قبول کیا جائے۔ کہنے کو تو وہ بھی کسی غیر نبی کی عصمت رائے کے قائل نہیں، مگر عملاً کسی بھی ایسے شخص کے بارے میں، جس کی عظمت ان کے دلوں پر چھائی ہوئی ہو، یہ سننا پسند نہیں کرتے کہ اس کی فلاں رائے ضعیف ہے، اس لیے لائق قبول نہیں۔

عقیدت مندی کا یہ غلو ایک طرف تو لوگوں سے قوت فیصلہ اور کھرے کھوٹے کی تمیز سلب کر لیتا ہے۔ دوسری طرف اس کے اپنے درمیان سے اٹھ جانے کے بعد انھیں حیران و ششدر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ نہیں جان پاتے کہ اب کدھر جائیں اور کیا کریں؟ اس وقت انھیں تحریک کے مستقبل کی اتنی فکر نہیں رہ جاتی جتنا کہ اس شخصیت سے محرومی کا غم لاحق ہوتا رہتا ہے۔

یہی بات حضرت سید احمد شہید" کی تحریک کے دوران جب ظہور میں آئی، تو اپنے آخری نتائج کے ساتھ ظہور میں آئی۔ یعنی شخصی عقیدت کے غلو کے اس فتنہ نے یہاں تک رنگ دکھایا کہ بے شمار لوگوں کو جدوجہد کے میدان سے نکال کر عزلت کے گوشوں میں بٹھا دیا۔

پس جب تک کسی تحریک کے کارکنوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی نہ ہو کہ ہمارا حقیقی قائد اور ہمارا رہنما کوئی شخص نہیں سوائے اس شخص کے جس کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے --- ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے دلوں کے اندر جب تک یہ حقیقت سرایت کیے ہوئے نہ ہو کہ رضائے الٰہی کے سوا ہماری سعی و جہد کی کوئی غایت مقصود نہیں ---- اس وقت تک اس تحریک کا حال خطرناک اور اس کا مستقبل خطرناک تر ہی رہے گا۔

۴۔ تصور دین کی بے اعتدالی

چوتھا اہم عامل "تصور دین کی بے اعتدالی" ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ احیائے دین کی کوئی تحریک جس وقت شروع ہوتی ہے، وہ ایسا وقت ہوتا ہے جب دین کی امانت دار ملت اپنے فرض منصبی سے عملاً غافل ہو چکی ہوتی ہے یا کم از کم یہ کہ وہ اس کے سلسلہ میں کوئی قابل لحاظ جدوجہد نہیں کر رہی ہوتی۔ اس کے اس رویہ کے پیچھے عموماً دو اسباب کارفرما ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں: ایک تو یہ کہ ملت کا احساس فرض، زندگی کی تڑپ کھو چکا ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا تصور دین بھی کسی نہ کسی حد تک ناقص اور غیر متوازن ہو چکا ہوتا ہے۔

اس حالت میں، اور ان اسباب کے پس منظر میں، جب کچھ لوگ اللہ کی توفیق پاکر میدان عمل میں نکل آتے ہیں، اور وہ دین حق کے اس پرچم کو اٹھا لیتے ہیں، جو نہ جانے کب سے کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوتا ہے، تو فطری طور پر ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ لوگ ہر طرف سے کھنچ کر اس کے نیچے آجائیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے بارے میں تو ان کی یہ خواہش شدید سے شدید تر ہوتی ہے۔ جو "مسلم" ہیں، اور جن کے نزدیک آج بھی اس لفظ مسلم کے معنی بدل کر، آخرت فراموش، خدا ناشناس اور خود پرست کے نہیں ہو گئے ہیں۔ اور جو ان آیتوں کو بھی، جن میں امت مسلمہ کا مقصد وجود صرف حق کی شہادت اور دین کی اقامت بتایا گیا ہے، قرآن کریم کی ویسی ہی آیات الٰہی یقین کرتے ہیں جیسا کہ نماز روزے وغیرہ کا حکم دینے والی آیتوں کو۔

اس فطری خواہش اور امید کے ساتھ وہ لوگوں کو بلانے کے لیے گلی گلی منادی کرتے پھرتے ہیں۔ ایک ایک دروازے کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے ہیں۔ جھونپڑیوں سے لے کر محلوں تک اور عبادت خانوں سے لے کر سیاست گاہوں تک ہر جگہ پکار آتے ہیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ کا جو حاصل نکلتا ہے وہ بالعموم ان کی امیدوں اور خواہشوں سے بہت کم ہوتا ہے۔ وہ بڑے دکھ اور بڑی حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ دلوں کے دروازے ان کی دعوت کے لیے کھل نہیں رہے ہیں، بلکہ الٹے پیشانیوں پر بل پڑنے لگے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ حیرت کے ساتھ سوچنے لگتے ہیں، کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز تو نہیں پیش کی جا رہی ہے جس کی حقانیت اہمیت اور ضرورت سے ایک مسلمان کو اختلاف ہو سکے، پھر یہ رد و انکار کس بنا پر ہے؟ اس سوچ بچار کے سلسلے میں جب وہ لوگوں کے اس رویہ کا ذہنی اور نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں، تو اس کے وہی دو اسباب نظر آتے ہیں، جن کا ابھی تذکرہ کیا گیا۔ یعنی احساس فرض کی مردنی اور تصور دین کی خرابی و بے اعتدالی۔ اس لیے اپنے مقصود و مدعا کی خاطر وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ان اسباب فساد کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

اب پہلی خرابی یا بیماری کے ازالے کے لیے وہ جو کچھ افہام و تفہیم کرتے ہیں، اس سے کم از کم سن ضرور لیا جاتا ہے۔ کبھی تو سر ندامت جھکا کر اور اپنی تقصیروں کا اعتراف کرتے ہوئے، اور کبھی ایک سنجیدہ خاموشی کے ساتھ۔

لیکن دوسری خرابی کی اصلاح کا معاملہ اتنا پرسکون نہیں ثابت ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دینی تصورات کی کسی خامی اور بے اعتدالی کا ازالہ اس وقت تک قریب قریب ناممکن ہی ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، جب تک کہ ان پر تنقید نہ کی جائے، اس لیے چاروناچار انھیں یہ ناگوار فرض بھی انجام دینا پڑتا ہے۔ لیکن افکار و نظریات پر تنقید خواہ کتنی ہی برحق اور محتاط کیوں نہ ہو، عموماً ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کی جاتی۔ پھر تنقید بھی وہ جو عام افکار و نظریات پر نہیں، بلکہ لوگوں کے محبوب و مالوف تصورات پر کی جائے۔ یہاں تو تنقید کا فقرہ ابھی پورا بھی نہیں ہو پاتا کہ لوگ بھڑک اٹھتے ہیں، اور ہر طرف تحریک کی مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور ضد و عناد کی وہ گرم بازاری ہوتی ہے کہ اس کے مسلمہ بنیادی اصول و مقاصد تک پر حملے شروع ہو جاتے ہیں۔ کبھی سامنے سے اور کبھی پیچھے سے، کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ۔

قدرتی طور پر تحریک کے کارکن بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ان کے اندر تقریباً ضروری اس کا ایک خاص ردعمل ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں ان ناقص تصورات دین کے خلاف ان کا رویہ اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ صاف دیکھتے ہیں کہ اس صورت حال کے ذمہ دار بہت کچھ یہی تصورات ہیں۔ یہ دینی ذہن رکھنے والے مسلمانوں کو بھی تحریک کے پیش کیے ہوئے نصب العین کی طرف آنے نہیں دے رہے ہیں، اس لیے اب ان کا فیصلہ بجا طور پر یہ ہوتا ہے کہ ان تصورات پر بھرپور ضرب لگائی جائے۔

لیکن دوسری طرف یہی وہ نازک وقت ہوتا ہے جب اہل تحریک خود بھی تصور دین کی ایک جوابی بے اعتدالی کے خطرے کی زد میں آ جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس وقت اس بات کا نہایت قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کے اس ردعمل میں غیر معمولی شدت اور غلو پیدا ہو جائے، اور وہ ایک غلطی کے جواب میں لاشعوری طور پر ایک دوسری غلطی کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اس موقع پر صرف وہی لوگ اس غلو سے محفوظ رہ سکتے ہیں جن کو خدا نے اونچے درجہ کی دینی بصیرت، قابل اطمینان سلیم الطبعی، اور ٹھوس فکری سنجیدگی عطا فرمائی ہو، ورنہ تحریک کی مخالفتوں کا ریلا عام لوگوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل دیتا اور اعتدال کی شاہراہ سے ہٹا کر ایک دوسرے عدم توازن کا شکار بنا دیتا ہے۔

مخالفت کرنے والے اگر کسی دینی مطالبے کو اتنا بلند مقام دینے پر مصر دکھائی دیتے ہیں جو دین میں اس کا فی الواقع ہے نہیں، تو وہ اسے اس کا واجبی مقام بھی دینے پر آمادہ نہیں رہ جاتے۔ اسی طرح اگر وہ کسی چیز کی صحیح دینی اہمیت تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہوں، تو یہ اسے اس کے واقعی مرتبے سے بھی بہت اوپر اٹھا دیتے ہیں۔

مثلاً عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ غیر معتدل ذہنیت کے لوگ، اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات میں سے کسی ایک صفت کو، اور اس کے تقاضوں کو، اس طرح ابھار دیا کرتے ہیں، کہ بعض دوسری صفات کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقاضے ان کے ذہنوں میں بڑی حد تک دب کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے دینی افکار و تصورات کا پورا ڈھانچہ لازماً غیر متوازن ہو رہتا ہے۔ ایسے لوگوں سے سابقہ پڑنے پر تحریک کے کارکنوں کا رد عمل یہ رخ اختیار کر سکتا ہے کہ وہ اسی صورت حال کو الٹ کر خود بھی اختیار کر لیں۔ یعنی دوسری صفات کے جو تقاضے دوسرے لوگوں کے ذہن میں دب کر رہ گئے ہوں، انھیں وہ اس شدت سے اپنے ذہنوں پر حاوی کر لیں کہ ان کے نیچے اب مذکورہ بالا پہلی صفت کے واقعی تقاضے دب کر رہ جائیں۔

یہ ایک اصولی مثال تھی۔ اس پر اسلامی تعلیمات کی ساری باتوں کو قیاس کر لیجیے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کسی جوابی بے اعتدالی کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ دین کی اصل اور مکمل حقیقت اب بھی بروئے کار نہ آسکے گی، اور اس کی حقیقی صورت زیبا پر بدستور پردہ پڑا رہ جائے گا۔ حالانکہ دینی تصور کی ہر بے اعتدالی بہرحال بے اعتدالی ہی ہے، خواہ اسے کسی تحریک کے علم بردار گروہ نے اختیار کر رکھا ہو یا کسی جمود پرست حلقے نے، اس کے مفاسد سے کسی حال میں بھی نہیں بچا جا سکتا۔ بلکہ شاید پہلی شکل میں تو یہ مفاسد اور زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ اس لیے کسی غیر متوازن دینی تصور کے ساتھ جو جدوجہد کی جائے .... اس کو کسی اور معنی میں تو چاہے دینی جدوجہد کہہ لیجیے مگر احیائے اسلام اور اقامت دین، کی جدوجہد قرار دینا ہرگز صحیح نہ ہو گا۔ ایسی جدوجہد کا انجام، دین کی واقعی اقامت کے نقطہ نگاہ سے بہرحال ناپسندیدہ ہی نکلے گا۔ ایک طرف تو صحیح دینی فکر و مزاج رکھنے والے لوگوں کے لیے وہ اپنے دروازے از خود بند کر لے گی۔ دوسری طرف اس کا ہر قدم جو آگے کو اٹھے گا، اصل شاہراہ سے کترا کر اٹھے گا۔ اور پھر آخر کار وہ امت کی تاریخ میں افتراق کے ایک نئے باب کا اضافہ کر کے ختم ہو جائے گی۔

۵۔ گروہی تعصب

پانچواں اہم عامل گروہی تعصب، ہے۔

انسان کی یہ ایک عام کمزوری ہے کہ وہ جس پیمانہ سے اپنے آپ کو ناپتا ہے، اسی سے دوسروں کو بھی ناپنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ساتھ حسن ظن سے کام لینے میں تو بڑا فیاض ہوتا ہے، مگر دوسروں کے معاملہ میں حد درجہ تنگ نظر بن جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تاویلیں اور رعایتیں تو سب میرے لیے ہوں، اور سخت گیریاں، سب کی سب غیروں کے لیے۔

اس جانبداری اور بے انصافی سے وہ اپنے ذاتی معاملہ کے محدود دائرے ہی میں کام نہیں لیتا بلکہ خاندانی اور قومی، نسلی، وطنی اور گروہی اور جماعتی معاملات کے وسیع دائروں میں بھی وہ اسی مذموم ذہنیت کا مظاہرہ کرتا ہے اور بسا اوقات تو یہاں اس کا ذوق ستم اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے...... اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وجہ یہ ہوتی ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں اگر وہ یہ روش اختیار کرتا ہے، تب تو ہر طرف سے اس کی مذمت اور لعنت ملامت ہی ہوتی ہے، حتیٰ کہ خود اس کا اپنا ضمیر بھی، بشرطیکہ وہ بالکل ہی مر نہ گیا ہو، اندر سے جھٹکے دے دیا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ حق و صداقت کا یہ خون، قوم اور ملت کے نام پر اور پارٹی اور جماعت کی خاطر کرتا ہے، تو اس کے خلاف ایک انگلی بھی نہیں اٹھتی۔ اس کے برعکس اسے داد و تحسین کے پھولوں سے لاد دیا جاتا ہے، زندہ باد کے نعرے اس کے کانوں میں رس گھولنے لگتے ہیں، اور اسے سر آنکھوں پر بٹھالیا جاتا ہے۔ رہا اس کا ضمیر، تو تحسین و آفریں کے ان پرجوش ہنگاموں اور مظاہروں میں اسے بھی جھوٹے اطمینان یا فریب خوردگی کا شکار بن ہی جانا پڑتا ہے۔

نفس انسانی کی یہ کمزوری بڑی ہی زبردست اور ساحرانہ قوت کی مالک ہوتی ہے۔ وہ گروہ بھی جس نے پاک اور سچے جذبہ سے کسی اسلامی تحریک کا علم اٹھایا ہو، اس کے حملوں سے یکسر محفوظ نہیں خیال کیا جاسکتا۔ اسلام کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس گروہی تعصب نے امت کو بار بار جس طرح پھاڑا ہے، آپ آج بھی تاریخ کی زبان سے اس کی پوری داستان سن سکتے ہیں۔ کتنی ہی دینی تحریکیں تھیں جو، حق کی خدمت اور اقامت کے نام اور جذبہ کے ساتھ اٹھائی گئیں، مگر اسی جاہلی عصبیت کا کرشمہ تھا کہ آخر میں کہیں سے کہیں نکل گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ تحریکوں کی ابتدا میں ایمان کا محتسب ساتھ ہوتا ہے، اور قرآن کی ترازوئے عدل ہاتھ میں، مگر جب اس موذی مرض کا حملہ ہوتا ہے تو اپنا گروہ اور اپنی جماعت ہی سب کچھ بن جاتی ہے۔ اس کا مفاد، حق کا مفاد اور اس کا دفاع، حق کا دفاع قرار پاجاتا ہے۔ اس کا ہر نظریہ اور ہر رویہ اس بات کا مستحق سمجھ لیا جاتا ہے، کہ جب اس پر نظر ڈالی جائے تو انتہائی حسن ظن اور احترام سے ڈالی جائے۔ اور اس پر بھی اگر کہیں سے اس میں کوئی نقص، نگاہ کے سامنے آہی جائے تو آنکھوں پر جھٹ دونوں ہاتھ رکھ لیے جائیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ہر نظریہ اور ہر رویہ کو سوئے ظن ہی کا حقدار سمجھا جاتا ہے، اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں انتہائی بخل سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا "اپنی" جماعت، انسانوں کی جماعت نہ ہوئی، جن سے صواب کے ساتھ خطا کا بھی امکان ہے، بلکہ فرشتوں کا کوئی مقدس گروہ ہے، جن کے قریب سے بھی کسی فکری یا عملی لغزش کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ظاہر بات ہے، کہ حق پسندی اور ہدایت یافتگی کا یہ اجارہ دارانہ تصور بجائے خود ایک بڑی گمراہی ہے، یہ اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ دل، ایمانی خلوص اور للہیت کی حلاوت سے محروم ہیں۔

اس گمراہی اور کج روی کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ حمایت حق اور ثبات ایمانی کا بھیس اختیار کیے ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں بلا کی کشش بھی ہوتی ہے، انسان کو اس پر کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ندامت کے بجائے الٹا ایک طرح کا فخر ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفس انسانی کے لیے وہ ضلالت بڑی مرغوب بن جاتی ہے، جس پر حقانیت کی نقاب پڑی ہو۔ جو بدنصیب اس "آفت ایمان" جاہلیت، کی مضبوط گرفت میں آجاتا ہے، وہ سورج سے بھی زیادہ روشن، حق کو، اگر اس کا تعلق کہیں "باہر" سے ہو، ٹھکرا دینے میں کوئی تامل نہیں کرتا، اور علمائے یہود کی طرح دوسروں کو بھی یہ تلقین کرنے لگتا ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (صرف اسی شخص کی بات مانو جو تمھارے اپنے مذہب کا پیرو ہو)

ایسی خطرناک بیماری کا جو گروہ شکار ہو جائے، اس سے یہ توقع نری حماقت ہی ہو گی، کہ اس کی کوششوں سے دین حق کو فروغ حاصل ہو سکے گا۔ جن لوگوں کی نگاہ میں جماعتی رشتوں اور جھوٹے گروہی وقار کو یہ مقام حاصل ہو، اور جو سچائی کے اعتراف میں "اپنے" اور "غیر" کا امتیاز روا رکھتے ہوں، وہ دراصل اپنے گروہ کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ کہتے ہیں، اگر کہتے ہیں کہ ان کا مقصد اللہ کا کلمہ بلند کرنا ہے۔ کوئی شخص اپنے خدا اور اپنے گروہ دونوں کی "پوجا" ایک ساتھ نہیں کر سکتا۔

۶۔ آزادی رائے کا غلط استعمال

چھٹا اہم عامل آزادی فکر و رائے کا غلط استعمال ہے۔

یہ غلط استعمال جب ایک خاص حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو تحریک، طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور طوائف الملوکی وہ بلا ہے جس کی موجودگی میں اس بات کی کوئی امید نہیں رہ جاتی کہ تاریخ صحیح رخ پر ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گی۔ آگے بڑھ سکنے کا کیا سوال، وہ تو الٹا پیچھے کی طرف تیزی سے لڑھکنے لگے گی، جیسے چڑھائی پر جاتی ہوئی کسی ٹرین کا انجن اس سے کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔

بلاشبہ غور و فکر کی قوت ہی انسان کا امتیازی جوہر ہے۔ اس لیے اس امر میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اس قوت کا استعمال ہر شخص کا پیدائشی حق ہے، جس سے اس کو کسی حال میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے اس حق کو از خود استعمال نہیں کرتا، وہ فی الواقع اپنے آپ کو انسانیت کے مقام سے گرا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے، جو دین فطرت ہے، اپنی سوجھ بوجھ سے کام لینے کو انسان کے بنیادی حقوق ہی میں نہیں، بلکہ اس کے بنیادی فرائض میں بھی شمار کیا ہے۔ وہ اس شخص کو جو عقل و فہم سے کام نہ لے کالانعام، (جانوروں کے مشابہ)، کہتا ہے۔ اور اس شخص کو، جو جانتے بوجھتے بھی حق بات ظاہر کرنے سے کنی کاٹ جائے، (گونگا شیطان) قرار دیتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ مقام اس نے عقل و فہم اور آزادی فکر و رائے کے صحیح، محتاط اور ذمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دارانہ استعمال کو دیا ہے نہ کہ غلط اور بے لگام استعمال کو۔ عقل و رائے کا غلط استعمال تو اس کے یہاں اتنا ہی مذموم ہے جتنا اس کا عدم استعمال مذموم ہے۔ چنانچہ اس نے ایسے وقت کو امت کے لیے انتہائی برا وقت بتایا ہے جب اس کے افراد سے، اپنے حدود بھول کر آزادی فکر و رائے کے غیر ذمہ دارانہ استعمال میں، چھوٹ ہو جائیں اور ہر شخص اپنی رائے کا پرستار بن جائے۔ اور اس کے نتیجے میں ہر طرف ایک ذہنی انار کی پھوٹ پڑے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہہ کے انداز میں فرماتے ہیں: یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ بخل کا ہر طرف غلبہ ہے، زمام کار نفس کی خواہشوں کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کو دین پر مقدم رکھا جا رہا ہے۔ اور ہر رائے والا اپنی ہی من مانی رائے پر فریفتہ ہے۔ ساتھ ہی تمہیں یہ محسوس ہو رہا ہے، کہ تم خود بھی ان میں سے کسی برائی میں مبتلا ہو رہے ہو، تو پھر بس اپنی ہی فکر میں لگ جاؤ۔ اور دوسروں کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔

خط کشیدہ الفاظ پر ٹھیر کر غور کیجئے! ان الفاظ میں بات صرف اتنی ہی نہیں کہی گئی ہے کہ جب ہر شخص اپنی رائے پر فریفتہ ہو، بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جب ہر رائے والا اپنی رائے پر فریفتہ ہو، گویا یہ صورت حال بھی کہ، ہر رائے رکھنے والا اپنی ہی رائے پر فریفتہ ہو رہے، ایک مخلص مسلمان کو امر بالمعروف اور اصلاح امت کے معاملے میں ہمت ہار جانے پر، حق بجانب قرار دے دیتی ہے۔ پھر اس صورت حال کا تقاضا کیا کچھ نہ ہو گا جب ہر شخص خواہ وہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ہو، یا نہ ہو، ایک رائے ظاہر کر کے اسی پر فریفتہ ہو رہے، اور اسی پر اڑ جانے کا وطیرہ اختیار کر لے۔

یہ تو مرض کی وہ انتہا ہے جس کے علاج کی ہمت ایک عام انسان کسی حال میں بھی نہیں کر سکتا۔ فکر و رائے کی آزادی کا غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ استعمال کتنا خطرناک فتنہ ہے، اس حکیمانہ ارشاد نبویؐ سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

دراصل کسی بھی جماعت کے لیے یہ قطعی ضروری ہے، کہ اس کے افراد کے اندر رائے میں کسر و انکسار کی پوری صلاحیت موجود ہو۔ کوئی شخص اگر ضروری غور و فکر کے بعد ایک رائے پر پہنچ جائے، تو اسے اس بات کا تو پورا حق حاصل ہے کہ وہ مناسب موقع پر اس کو دلائل کے ساتھ پورے زور سے پیش کرے۔ مگر اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا کہ تمام لوگوں سے، اسی کو بہرحال صحیح اور برحق تسلیم کر لینے پر اصرار کرے۔ اس کے بخلاف اسے اس امکان کو لازماً سامنے رکھنا چاہیے کہ اس کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، اور دوسروں کی صحیح۔ ہو سکتا ہے، کہ اس کی نگاہ زیر بحث مسئلہ کے سارے گوشوں پر نہ پہنچ رہی ہو، یا دوسرے لوگ اپنی رائے کے حق میں جو دلیلیں دے رہے ہیں، کسی وجہ سے ان کا ٹھیک ٹھیک وزن وہ محسوس نہ کر پا رہا ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان تمام امکانات کا لحاظ رکھنے کے باوجود بھی اگر وہ اپنی رائے کے درست ہونے پر آخر وقت تک مطمئن رہے، لیکن دوسرے شرکاء مشورہ کو اپنی اس رائے سے متاثر و متفق نہ بنا سکے، اور کثرتِ رائے سے فیصلہ اس کے خلاف ہو رہا ہو، تو اسے اب پوری فراخ دلی کے ساتھ اس فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور عمل کی حد تک اپنی رائے سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اِلّا آنکہ یہ فیصلہ بالفرض تحریک کے اصول و مقاصد تک کو علانیہ ختم کر دینے والا ہو، اور اس کے سلسلہ میں خدانخواستہ اسلام کی منصوص ہدایات تک پسِ پشت ڈال دی گئی ہوں۔ لیکن جب تک نوعیت اجتہادی اختلافات ہی کی ہو، اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بدستور اپنی رائے پر جما رہے۔ ورنہ اس تحریک اور جماعت کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا جس کے افراد اجتماعی فیصلوں کے مقابلہ میں اپنے ذوق و رجحان ہی کو نہیں، بلکہ اپنی سوچی سمجھی رائے کو بھی قربان کر دینے کے لیے تیار نہ ہوں۔ آخر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس بشر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے اور صواب دید کو فیصلہ کن سمجھے۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپؐ نے بھی کئی بار دوسروں کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کر دی تھی۔ حالانکہ اگر آپؐ تمام کے تمام صحابہؓ کی متفقہ رائے کے خلاف بھی کوئی فیصلہ صادر فرما دیتے، تو ایک شخص بھی اس کی پیروی سے انکار نہ کرتا۔ پھر کسی زید یا بکر کو اپنی رائے پر ایسے اصرار کا استحقاق کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے کہ گویا وہ کوئی انسانی رائے نہیں ہے، بلکہ آسمانی وحی ہے جس کے ساتھ تنقید اور انکار کا رویہ اگر اپنایا گیا تو اسلام اور ایمان کا سررشتہ ہی ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

غرض آزادیِ فکر و رائے اور چیز ہے، اور رائے پرستی و خود پسندی دوسری چیز۔ آزادیِ فکر و رائے کے صحت مندانہ استعمال کی شکل میں اسلامی تحریک کی ساری توانائی اپنے مقابل محاذ پر ـ ـ ـ باطل کے خلاف ـ ـ ـ صرف ہوتی رہتی ہے، اور اس کے قدم مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ مگر رائے پرستی و خود پسندی کے زہر سے مسموم تحریک و جماعت کی قوتیں، پورس کے ہاتھیوں کی طرح خود اپنے ہی مورچہ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں تحریک اپنے ہی "غازیوں" کے ہاتھوں "شہید" ہو جاتی ہے۔

چنانچہ امت کی تاریخ اس حقیقت کی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، کہ خلافت راشدہ کے اختتام سے پہلے ہی امت کے درمیان اختلاف و نزاع کی جو تلوار نکل پڑی تھی، وہ آج تک نیام میں واپس نہیں جا سکی ہے، اور جو دین، وحدتِ فکر و عمل کا نقیب بن کر آیا تھا، آج اس کے ماننے والے ستر، بہتر ٹکڑیوں میں بکھرے پڑے ہیں، تو اس نادیدنی صورتِ حال کا ایک اہم سبب اختلافی امور و مسائل میں یہی رائے کا بے جا اصرار بھی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے ہوتے یہ ذوق اتنا پختہ ہو چکا ہے، کہ اب ثانوی اہمیت کے چند مخصوص افکار و مسائل کی حفاظت ہی شہادت حق کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ رائے پرستی کے مریض اشخاص کو عموماً اپنے مریض ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس مرض ہی کو تندرستی کی سند خیال کر لیتے ہیں۔ انھیں کچھ اس طرح کا وہم ہو جاتا ہے۔ کہ اپنی فلاں رائے یا صواب دید کو چھوڑ دینا گویا استقامت علی الحق کے مقام سے گر جانا ہے۔

رائے پرستی کا یہ مرض جب اس شدت کو پہنچ جاتا ہے، تو ان کا ایک ایک سانس اختلاف و انتشار کے مہلک جراثیم اگلنے .. ہے، اور معاشرہ ارجانی فتنوں کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔۔۔ کہنے کو تو ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کا متحد الاقدام قافلہ، مگر حقیقت میں الگ الگ وادیوں اور بھٹکنے والے مسافروں کی الگ الگ ٹولیاں، اور ہر ٹولی، كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (اور ہر ٹولی اپنے اپنے کام پر خوش) کی مصداق یقیناً ایسی خوف ناک ذہنیت اور کج روی سے ہر اس تحریک کو ہزار بار اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے، جو اللہ کے دین کو از سرِ نو زندہ کرنے، اور اسے کتاب و سنت کے اوراق سے لے کر زندگی کے پھیلے ہوئے میدان میں اس کی پوری روح اور مکمل ہیئت کے ساتھ برپا کر دینا چاہتی ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دستِ تعاون بڑھایئے

الخدمت ویلفیر سوسائٹی (رجسٹرڈ) نے پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے تعاون سے کراچی کے پسماندہ علاقے ضلع غربی میں اورنگی ٹاؤن، قصبہ، علیگڑھ کالونی، بنارس اور قرب و جوار میں رہائش پذیر دکھی لوگوں کے لئے جدید اور معیاری سہولیات سے آراستہ ۱۰۰ بستروں کے ہسپتال کا منصوبہ تشکیل دیا ہے۔

اس منصوبے کے تعمیراتی اخراجات اور طبی آلات کا تخمینہ دو کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔

الخدمت ہسپتال

بالمقابل اورنگی ٹاؤن تھانہ، اورنگی ٹاؤن۔ کراچی۔

فون :۔ فیکس :۔

الخدمت ہسپتال کی تعمیر کے لئے اپنے عطیات بنام الخدمت ویلفیر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ) اکاؤنٹ نمبر ۶/۷ مسلم کمرشل بنک، خداداد کالونی برانچ میں جمع کروائیں۔

الخدمت ویلفیر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ)

عطیہ اشتہار = الطاہر ریسٹورنٹ [illegible] شاہراہ پاکستان - کراچی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنگلہ دیش پر
مغربی استعمار کی نئی یلغار

مسلم سجاد

زمانہ بدلا، تو مغربی عیسائی استعمار نے اپنا روپ اور اپنے طور طریقے بھی بدل دیے۔ مسلمانوں پر تسلط رکھنے کے لیے ان کو براہ راست اپنے قبضہ میں رکھنا ممکن نہ رہا، تو پرانے شکاریوں نے نئے جال بچھا دیے۔ پہلے فکر معاش دے کر روح قبض کی، پھر ترقی معاش کے سراب کا دیوانہ بنایا، اور پھر امداد اور قرضوں کے سنہری تاروں میں باندھ کے بے دست و پا کر دیا۔ افسوس کہ فرعون کو کالجوں اور بہبود آبادی کی نہ سوجھی، ورنہ مفت میں قتل اولاد کے لیے بدنام نہ ہوتا۔

ایک نیا سنہری جال این جی اوز NGOs یا نان گورنمنٹل آرگنائزیشن کا، یعنی غیر سرکاری تنظیموں کا ہے۔ ترقی و تعلیم، فلاح و بہبود اور ریلیف کے نام پر این جی اوز کس طرح ایک پس ماندہ مسلمان ملک کو اپنے شکنجہ میں کس لیتی ہیں، اس کی ایک مثال بنگلہ دیش ہے۔ کیوں کہ بنگلہ دیش خانہ جنگی اور بڑی تباہ کاری کے نتیجے میں بنا، اس لیے وہاں کی زمین ترقی و بہبود کے بھیس میں کام کرنے والی ان تنظیموں کے لیے کچھ زیادہ ہی زرخیز ثابت ہوئی۔ حکومت بنگلہ دیش نے ان تنظیموں کو قواعد و ضوابط کا پابند بنانے کا سوچا، اور ان کی نگرانی کے لیے ایک این جی اوز بیورو قائم کیا۔ مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، اور جلد ہی اس کو مغرب کے "فیاض و مخیر" ممالک کے آگے گھٹنے ٹیکنا پڑے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کے نتیجے میں ان تنظیموں کے بارے میں قیمتی معلومات جمع ہو گئیں۔ پاکستان، ہمارے علم کی حد تک، ان معلومات سے بھی محروم ہے۔ بنگلہ دیش میں این جی اوز کے تاریک سایوں کے بارے میں ہم امپیکٹ انٹرنیشنل، لندن کے شکریہ کے ساتھ ان کے مضمون کا ملخص ترجمہ ذیل میں شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگست ۱۹۸۹ ڈھاکا کے اخباروں نے سنسنی خیز سرخیاں لگائیں : "حکومت نے بدطینت اور بدعنوان این جی اوز کے آگے ہتھیار ڈال دیے"، "ایسٹ انڈیا کمپنی واپس آگئی ہے"، "ہماری آزادی پر نقب لگانے کا منصوبہ"۔

ہوا یہ تھا کہ این جی اوز بیورو کے ڈائریکٹر جنرل نے دو تنظیموں کی رجسٹریشن منسوخ کر دی تھی۔ ایک ادب (ADAB)، یعنی ایسوسی ایشن آف ڈویلپمنٹ ایجنسیز ان بنگلہ دیش جسے قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب اور سیاسی سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا تھا۔ دوسری سبا (SEBA)، یعنی سوسائٹی فار اکنامک اینڈ بیک ایڈمنسٹریشن جو خورد برد اور بغیر اجازت ایک غیر ملکی سفارت خانہ سے رقوم وصول کرنے کی مرتکب تھی۔ یہ فیصلہ وزیراعظم سیکرٹریٹ میں کیا گیا، لیکن مغربی سفارت خانے فوراً حرکت میں آئے اور تین گھنٹے کی مختصر مدت میں "ادب" اور "سبا" دونوں اپنے کام پر واپس آگئیں۔

حال میں یہ کہانی ایک مرتبہ پھر دہرائی گئی، جب این جی او بیورو نے خورد برد اور پیسہ دے کر لوگوں کا مذہب تبدیل کرانے پر انٹرنیشنل کرسچین فیلوشپ اور بعض دوسری تنظیموں کا رجسٹریشن منسوخ کردیا۔ سرپرست سفیران کرام کا ایک وفد فوراً وزیراعظم کے پاس پہنچ گیا، اور انھیں بتایا کہ "اگر ان اداروں کو بحال نہیں کیا گیا تو حکومت کی امداد روکی جا سکتی ہے"۔ خالدہ ضیا جانتی تھیں کہ یہ خالی خولی دھمکی نہیں۔ احکام واپس لے لیے گئے، اور بیورو کے ڈائریکٹر جنرل، شاہد العالم کا فی الفور تبادلہ کر دیا گیا۔

اخبارات ہی نہیں، بنگلہ دیش کے عوام بھی کئی مقامات پر ان تنظیموں کے خلاف غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے سڑکوں پر نکل کر بڑے بڑے مظاہرے کر چکے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی کہانی نہیں جو حکومت کے علم میں نہ ہو۔ اس کی فائلوں میں سب معلومات موجود ہیں۔ بات یہ نہیں کہ وہ کچھ کرنا نہیں چاہتی، بلکہ وہ بے بس ہے اور کچھ کر نہیں سکتی۔

تعداد اور وسائل

بنگلہ دیش ان ملکوں میں سرفہرست ہے جہاں چپہ چپہ پر بیرونی این جی اوز کا جال بچھا ہوا ہے۔ ملک بھر میں ان کی تعداد ۱۶ ہزار ہے، یعنی اوسطاً ہر ۵ ۳ مربع میل میں ایک۔ این جی اوز کی کل آمدنی کے بارہ میں صحیح اعداد و شمار میسر نہیں۔ اس لیے کہ، حکومت کے ضابطوں کے باوجود، یہ اپنے تمام وصول کردہ فنڈز ظاہر نہیں کرتیں۔ ۱۹۸۴ میں صرف عیسائی تنظیموں کی سالانہ ظاہر کردہ آمدنی ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر تھی۔ لیکن ورلڈ بنک، ایشین ڈویلپمنٹ بنک اور دوسرے امدادی ادارے ان تنظیموں کو اس سے کہیں زیادہ رقوم فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، این جی اوز کو ان کی حکومتیں براہ راست بھی فنڈز فراہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتی ہیں۔ مزید ستم یہ کہ مختلف ملک اور ادارے جو امداد بنگلہ دیش کو دیتے ہیں، اس میں یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ اس امداد کا ایک مخصوص حصہ ان کی نامزد کردہ این جی اوز کے ذریعہ ہی خرچ کیا جائے گا۔ مثلاً، امریکا یہ پابندی لگاتا ہے کہ فوڈ فار ورک (کام کے بدلہ غذا) پروگرام کی رقوم ایک عیسائی خیراتی ادارہ کیئر (Care) کے ذریعہ ہی خرچ کی جائیں گی۔

ان تنظیموں کو ملنے والی بھاری رقوم کا بڑا حصہ ان کے اپنے ہی اللوں تللوں میں اڑا دیا جاتا ہے۔ ۶۰ فی صد فنڈز غیر ملکی رضاکاروں، ماہرین اور مشیروں کی بھاری تنخواہوں اور سہولتوں پر لگ جاتے ہیں، ۱۰ فی صد دفتری اخراجات پر جبکہ بنگلہ دیشی عملہ کے حصہ میں ۱۵ فی صد آتا ہے، مگر جن غریبوں کے درد میں یہ تنظیمیں میدان میں آئی ہیں ان کو مشکل سے ۵ فیصد نصیب ہوتا ہے۔ جس ملک میں ماہانہ آمدنی ایک ہزار ٹکا (۲۵ ڈالر) سے مشکل ہی سے بڑھ پاتی ہے، وہاں کچھ این جی اوز کے سربراہ ایک لاکھ سے تین لاکھ ٹکا تک تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ بڑی بڑی رقمیں مہنگے نئے ماڈل کی کاروں اور افسران کے لیے فائیو اسٹار ریسٹ ہاؤسوں کی تعمیر پر خرچ کی جاتی ہیں۔ پلاننگ کمیشن کے ممبر، ڈاکٹر شیخ مقصود علی کی رائے میں این جی اوز کے ترقیاتی بجٹ کا ۸۰ فی صد مستحقین کو پہنچنے کے بجائے انھیں پہنچانے والوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔ پلاننگ کمیشن کے سامنے پیش کیے گئے منصوبوں میں اکثر اعداد و شمار غلط ہوتے ہیں، اور زمین، دفاتر اور رسل و رسائل کی مدوں میں تخمینہ اصل سے کہیں زیادہ ظاہر کیا گیا ہوتا ہے۔

اخراجات کی مدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر این جی اوز اپنے فنڈز اعلان کردہ منصوبوں سے ہٹ کر دوسرے منصوبوں پر خرچ کرتی ہیں۔ این جی اوز بیورو کے آڈیٹروں نے ۱۰۰ تنظیموں کے حسابات دیکھے تو ۸۰ فی صد میں مالی بدعنوانیوں، کرپشن اور خفیہ بنک اکاؤنٹوں کا انکشاف ہوا۔ ایک تنظیم نے تقریباً ۳۰ لاکھ ٹکا ریلیف ورک کے لیے نکالے، لیکن صرف ۳۲ ہزار ۷ سو ٹکا تقسیم کیے۔ دو اور این جی اوز کے حسابات میں سائیکلون ریلیف کے بہانہ ۵۰ لاکھ اور ایک کروڑ ٹکا کی رقمیں غلط مدوں میں خرچ کی گئیں۔

این جی اوز اپنے فنڈز کے ذریعہ سیاسی اثر و رسوخ بھی خریدتی ہیں۔ سرکاری افسروں سے بنگلے اونچے اونچے کرایوں پر حاصل کیے جاتے ہیں، اور ان کے بچوں، بھانجوں اور بھتیجوں کو بے نام کی عمدہ ملازمتیں دی جاتی ہیں۔

ان این جی اوز کا اپنے بارہ میں پھیلایا ہوا امیج (تاثر) یہ ہے کہ وہ "دنیا کے غریب ممالک میں غربت دور کرنے اور تعلیم و ترقی عام کرنے میں مقامی حکومتوں اور عوام کی شریک کار ہیں"۔ لیکن بنگلہ دیش کے چوٹی کے ماہرین معاشیات کی رائے ہیں: "ان کے ملک میں طاقت ور اور مال دار مغربی شرکائے کار کے ارتکاز کے باوجود، حقیقی ترقی میں ان کا حصہ نہ صرف بہت کم، بلکہ سماجی لحاظ سے منفی ہے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر شیخ مقصود علی پلاننگ کمیشن کے رکن ہیں۔ انھیں ایسی کوئی شہادت نہیں ملی کہ بھاری فنڈز دینے کے باوجود ان علاقوں میں لوگوں کی شرح آمدنی میں کوئی اضافہ ہوا ہو جہاں این جی اوز نے اپنے منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔ ڈاکٹر سید مصباح الدین، جہانگیر نگر یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کے بقول بھی ترقی کے دو اہم سیکٹروں، یعنی زراعت اور صنعت میں این جی اوز کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ان کی ایک سرگرمی، چھوٹے کاروبار کے لیے قرض دینے کی بھی ہے۔ لیکن واپسی کا نظام ایسا ظالمانہ ہے کہ قرضہ دار ۲۰ سے ۳۰ فیصد سود ادا کرتا ہے۔ ایک تنظیم ۲۲۶ فیصد سود حاصل کر لیتی ہے۔ این جی اوز بیورو کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ تنظیمیں غریبوں کی محتاجی ختم کرنے کے لیے شاذ ہی کام کرتی ہیں۔ بیشتر غریبوں کے حقیقی مسائل سے بے نیاز ہوتی ہیں اور انھیں ان لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نیمنی اور مانک گنج کی بعض آبادیاں ان غیر ملکی تنظیموں کی اتنی محتاج ہو گئی ہیں کہ عملاً ان کی رعایا بن کر رہ گئی ہیں۔ کئی بنگلہ دیشی مبصرین کی رائے میں یہ شکنجہ تو روایتی ہندو بنئے کے شکنجہ سے بھی زیادہ خوفناک اور خطرناک ہے۔

عیسائیت مذہبی اور سماجی تبدیلی کا منصوبہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ این جی اوز دراصل کیا کام کر رہی ہیں؟ ایک سیاسی و سماجی انقلاب برپا کر کے "روشنی اور تہذیب" لانا، اور "تاریک اور شب گرفتہ" مسلم بنگال کی دھرتی پر تعمیر و ترقی کی چکاچوند کرنا!

این جی اوز کی بڑی تعداد عیسائی مشنریوں پر مشتمل ہے، اگرچہ بالعموم ان کے ناموں سے یہ حقیقت ظاہر نہیں ہوتی۔ ان میں سے کچھ تو علانیہ کہتی ہیں کہ وہ انجیلی ہیں، جبکہ اکثریت کی مثال خیمے کی "کھونٹیوں" جیسی ہے۔ یہ "کھونٹیاں" اپنے طریقۂ واردات میں بے حد عیار اور چالاک ہیں۔ یہ اپنے مبلغ ہونے کا اظہار نہیں کرتیں، بلکہ سماجی کارکن، تاجر، انجینئر اور ڈاکٹر کے بھیس میں اپنا کام کرتی ہیں۔

بنگلہ دیش میں مشنریوں کی سرگرمیوں کا آغاز ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں عیسائیوں کی تعداد ۵۰ ہزار تھی، مئی ۱۹۷۱ء میں یہ تعداد چار گنا ہو کر دو لاکھ تک پہنچ گئی، اور ۱۹۹۱ء میں یہ تعداد دگنی ہو کر چار لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ این جی اوز کا ہدف اگلے ۲۰ سال میں اس تعداد کو ایک کروڑ تک پہنچانا ہے۔

"اسد ایونیو" زیادہ تر نئے عیسائیوں کی ملکیت ہے، اور میرپور "گرجوں کا شہر" بن چکا ہے۔ تشویشناک امر یہ ہے کہ مسلمان بھی عیسائی بن رہے ہیں۔ انڈونیشیا کی طرح اب بنگلہ دیش بھی یہ رائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر کرتا ہے کہ یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ ایک مسلمان، عیسائی نہیں بن سکتا۔ ایک "متزلزل مسلمان" کو اب پہلے سے کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ "متزلزل عیسائی" بننے کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔

بنگلہ دیش بنا تو اس نے خود کو ان بین الاقوامی طاقتوں کی گود میں پایا، جن کا اپنا معاشی، سیاسی اور مذہبی ایجنڈا تھا۔ وہ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی خواہاں تھیں اور اس کی سماجی، معاشی اور سیاسی ساخت کو اس حد تک کمزور کرنا چاہتی تھیں کہ جہاں قوم خود بخود ایک نئی نو آبادیاتی ٹوکری میں جا گرے۔ ڈھاکہ میں ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن (وائی ایم سی اے) کے جاری کردہ کتابچے "عوام سے عوام تک" میں لکھا ہے: "بنگلہ دیش کے سماجی ڈھانچے کو تعلیمات انجیل کے مطابق ڈھالنے کے عمل میں عیسائی تحریک کو لازماً ایک بھرپور قوت ہونا چاہیے"۔

بنگلہ دیش میں سرگرم عمل غیر ملکی فلاحی تنظیموں کے مقاصد میں کسی قسم کا کوئی ابہام یا اختلاف نہیں ہے۔ کسی کا مطمح نظر فلاح و بہبود نہیں ہے، سب کا مقصد یہ ہے کہ قوم کے سماجی ڈھانچے کو تبدیل کیا جائے۔

این جی اوز بیورو نے ایسی ۵۲ این جی اوز کی نشاندہی کی ہے جو براہِ راست لوگوں کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں۔ مگر مذہبی اور سیکولر این جی اوز میں فرق صرف ظاہری وضع کا ہے، مقاصد کا نہیں۔ سیکولر این جی اوز مذہبی لحاظ سے غیر جانبدار ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، مگر معاشرے کی روح اور اقدار کو بگاڑنے میں معاونت کرتی ہیں۔ جب کہ مشنری این جی اوز کھلے بندوں تباہ حال روحوں کی پکی فصل کاٹنے کے لیے کوشاں ہیں۔

این جی اوز بیورو رپورٹ نے ان کے طریقوں کی ایک دلچسپ اندرونی تصویر پیش کی ہے۔ مذہب کی تبدیلی اور عیسائی بنانے کے لیے کمزوروں کا انتخاب کیا جاتا ہے یعنی عورتیں، بچے، ان پڑھ یا بے یار و مددگار اور غربت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے بے بس اور محروم لوگ۔ کچھ این جی اوز مسلمان سمیت اپنے تمام عملے کے لیے بائبل پڑھنا لازمی قرار دیتی ہیں۔ ایک بڑی مشنری این جی او نے اپنے قائم کردہ اسکولوں میں صرف عیسائی اساتذہ مقرر کیے ہیں اور ہوسٹل میں رہنے کے خواہش مند طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عیسائی ہوں۔ اکثر مشنری سکولوں میں طالب علموں کے لیے عیسائیت پڑھنا لازمی ہے۔ ایسے ہی ایک کیس میں جب ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر نے اس بے ضابطگی کی طرف توجہ دلائی تو اسے جواب ملا: "ہمیں آپ کی حکومت فنڈ دیتی ہے نہ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں"

اکثر عیسائی این جی اوز کی پالیسی ہے کہ "مسلمان کو آخر میں ملازمت دو اور نئے عیسائی کی دستگیری کرو"۔ اس پالیسی کا مقصد معاشی اور تعلیمی لحاظ سے ایک موثر عیسائی طبقہ پیدا کرنا ہے جو، افریقہ کے بہت

© rasailojaraid.com